احمد فراز

چاند اور میں

احمد فراز

چاند سے میں نے کہا! اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح

انتساب

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

"گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست"

ترتیب

بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے

فضا نورد بادل

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوائے جا

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا

گذرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے

میرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا

چلو اسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو۔

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت

سائے کی نہ خود سے بھی رم کر

دولت درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا

یاد آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے

چاند اور میں

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا

لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی

فقیہ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا

دیباچہ

یہ قصہ پرانا ہے

جب بعض ہونٹوں نے چاہا

کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں

تو خود ان کو زہراب پینا پڑے تھا

کہ اہلِ حکم یہ ڈر تھا

یہ الفاظ

آواز کی زندگی سے

کوئی داستاں بن نہ جائیں

......اور وہ ہونٹ چپ ہو گئے تھے

سسکتے تڑپتے ہوئے لفظ

قاتل کی شمشیر سے نیم جاں

مدتوں تک فراقِ صدا میں

دھڑکتے رہے ہیں

کسے کیا خبر تھی

کہ ان بسملوں کا لہو......قطرہ قطرہ

لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا

اور اب یہ

لہو کی لکیریں

بجائے خود اک داستان بن گئی ہیں

غزل

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو

مری مثال کہ اک نخل خشک صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخ چمن کا طائر تو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تو

فضا اداس ہے ، رت مضمحل ہے میں چپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو

فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحب زر اور صرف شاعر تو

وفاپرست صلیبیں

وہ دن بھی یاد ہیں مجھ کو کہ جب مری دنیا
کہاں کے جسم کہ سایوں کو بھی ترستی تھی
پھرا ہو کوچہ بہ کوچہ متاعِ درد لیے
اگرچہ خلق مری سادگی پہ ہنستی تھی

سدا جلاتی رہی ہے یہ مجھے محرومی
وہی تھا میں وہی صحرائے آرزو کے سراب
کوئی نہ تھا کہ میں جس کے حضور نذر کروں
یہ آنسوؤں کے چراغاں، یہ شاعری کے گلاب

یہ زخم وہ تھے جو فن کے لیے چراغ بنے
مرا شریکِ سفر بس مرا شعور رہا
کسی سے کر نہ سکا دردِ نارسا کا گلہ
وہ روز و شب تھے کہ تنہائیوں سے چور رہا

رہِ طلب میں پھر اک یہ مقام بھی آیا
کہ دل گرفتہ ہے تو میری زندگی کے لیے
میں دیکھتا ہوں کہ تیری اداس آنکھوں میں
وفا کی آنچ لیے ہیں عقیدتوں کے دیئے

کسے عزیز نہ وہ گی تیری طلب کی لگن
ہزار دل پہ پڑی ہو غم زمانہ کی دھول
کسے غرور نہ ہو گا اگر تری چاہت
کھلائے دشت تمنا میں التفات کے پھول

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیت ہے زندگی بھر کی
کبھی گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
کبھی قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

غزل

عجیب رت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
بہت ملول تھا میں ، اداس تھا وہ بھی

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اس کو بھول چکے
مگر گماں تھا یہ بھی ، قیاس تھا وہ بھی

کہاں اب غم دنیا کہ اب غم جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ راس تھا وہ بھی

فراز تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اسے سنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصے
جو اس سے ملنے سے پیش تر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنہیں میری آرزو تھی مری طلب تھی
کہ جن میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ ان میں کچھ کو تو میں نے
جان سے عزیز جانا
مگر انہیں میں سے بعض کو
میرے بے دلی سے شکایتیں تھیں
میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدن سے سنا رہا تھا

مگر وہ پتھر بنی

مجھے اس طرح سے سنتی رہی

کہ جیسے مرے لبوں پر

کسی مقدس ترین صحیفے کی آیتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں

کہ تیری اداس ادھوری

محبتوں کی کہانیاں

جو بڑی کشادہ دلی سے

ہنس ہنس کے سن رہا تھا

وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ

باوفا ثابت قدم

کہ جس کی جبیں پہ

ظالم رقابتوں کی جلن سے

کوئی شکن نہ آئی

وہ ضبط کی کربناک شدت سے

دل ہی دل میں

خموش، چپ چاپ

مر گیا ہے۔

غزل

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی انداز مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے تو سن ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اسے رلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی

جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا نظر آیا نگار خانہ وہ

فراز خواب سی غفلت دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہوئے فسانہ وہ

کون سا نام تجھے دوں؟

یوں بھی گزری ہے کہ جب درد میں ڈوبی ہوئی شام
گھول دیتی ہے مری سوچ میں زہرِ ایام
زرد پڑ جاتا ہے جب شہرِ نظر کا مہتاب
خون ہو جاتا ہے ہر ساعتِ بیدار کا خواب
ایسے لمحوں میں عجب لطفِ دل آرام کے ساتھ
مہرباں ہاتھ ترے ریشم و بلور سے ہاتھ

اپنے شانوں پہ مرے سر کو جھکا دیتے ہیں
جس طرح ساحلِ امید سے بے بس چہرے
دیر تک ڈوبنے والے کو صدا دیتے ہیں

یوں بھی گزری ہے کہ جب قرب کی سرشاری میں
چمک اٹھتا ہے نگاہوں میں ترے حسن کا شہر
نہ غمِ دہر کی تلچھٹ، نہ شبِ ہجر کا زہر
مجھ کو ایسے میں اچانک ترا بے وجہ سکوت
کوئی بے فیض نظر یا کوئی تلوار سی بات
ان گنت درد کے رشتوں میں پرو دیتی ہے
اس طرح سے کہ ہر آسودگی رو دیتی ہے

کون سا نام تجھے دوں مرے ظالم محبوب
تو ہی قاتل ہے مرا تو ہی مسیحا میرا

غزل

تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل!
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں

تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درد میں ابھی انہی گہرائیوں میں ہوں

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگل میں ہوں

تو لوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
میں لٹ کے بھی وفا کے انہیں قافلوں میں ہوں

بدلا نہ مرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کر تو بھی تو روئے گا عمر بھر

یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود بھی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
اور خود فراز اپنے تماشائیوں میں ہوں

تخلیق

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں
زخم دل جاگ سکے ، نشتر غم رقص کرے
جو بھی سانسوں میں گھلا ہے اسے عریاں نہ کرو
چپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزام دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہوئے بت
جذبۂ کاوشِ خالق کو نگونسار کریں
موقلم حلقۂ ابرو کو بنا دے خنجر
لفظ نوحوں میں رقم مدح رخ یار کریں
رقص مینا سے اٹھے نغمۂ رقص بسمل
ساز خود اپنے مغنی کو گنہگار کریں

مرہم اشک نہیں زخم طلب کا چارہ
خوں بھی روئے گے تو کس خاک کی سج دھج ہو گی
کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر
جو بھی دیوار اٹھاؤ گے وہی کج ہو گی
کوئی پتھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
جو بھی تصویر بناؤ گے اپاہج ہو گی

یہ کیسی رت ہے

یہ کیسی رت ہے
کہ ہر شجر
صحن گلستاں میں
ملول و تنہا سلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیر پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں تو پھر لوٹ کر نہ آئیں

یہ کیسی رت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پر
سپیدۂ صبح کا گماں ہو
نہ فصل گل ہے
کہ ہر طرف شور جانفروشاں سے
کوئے محبوب کا سماں ہو
نہ دور پت جھڑ کا ہے
کہ نہ بے جان کونپلوں کو
امید فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رت ہے

کوئی تو بولے

کوئی تو دھڑکے

کوئی تو بھڑکے
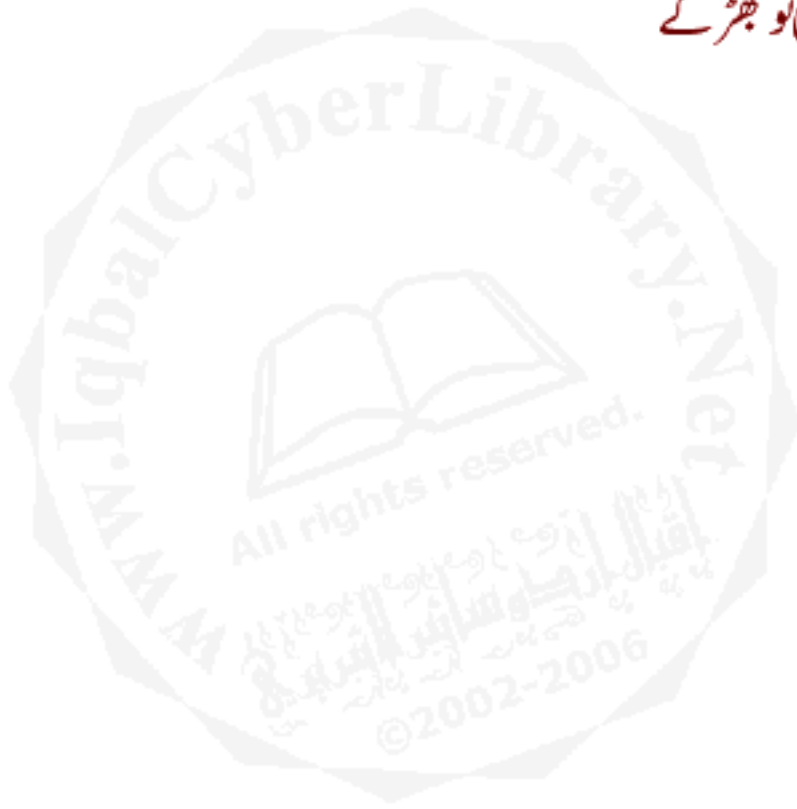
غزل

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوت غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

زندگی تری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

غزل

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے دل نذر کیا جاں واری ہے

جب ساز سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہل ستم کچھ اہم چشم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ گئے دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے

جب پرچم جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہل ہوس یہ بھول گئے
یہ خاک وطن ہے جان اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

میں کیوں اداس نہیں

(جنگ ستمبر ۶۵ء کے موقع پر لکھی گئی)

لہولہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ منزل اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی ہو
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو، ویت نام ہو کہ بٹ مالو
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج مرا
متاع درد سبھی پر نثار اپنی ہو

نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتش احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خون جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوح وفا برگِ زرد ہے میری

گواہ ہیں میرے احباب میرے شعر ثبوت
کہ منزل رسن و دار گرد ہے میری

بجا کہ امن کا بربط اٹھائے آج تلک
ہمیشہ گیت محبت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی
بجا کہ پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی پھوار
ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

میں سنگدل ہوں نہ بیگانہ وفا یارو
نہ یہ کہ میں ہوں کسی خواب زار میں کھویا
تمہیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے
تو بند رہ نہیں سکتا مرا لب گویا

وہ مرگ ہم نفساں پہ حزیں نہیں ہے تو کیوں
جو فاطمی و لولمبا کی موت پر رویا

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر
مرا جگر بھی لہو ہے یہ وقف یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لیے

جز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں نوحے
یہ شہر زندہ دلاں آج بھی اداس نہیں

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کے معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم
وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

"گریز از صفِ ماہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

غزل

اب شوق سے کہ جاں گزر جانا چاہیے
بول اے ہوائے شہر کدھر جانا چاہیے

کب تک اسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی ادھر جانا چاہیے

وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گرد سفر جانا چاہیے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمنا کہیں ملے
ہے دل تہی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیے

یا اپنی خواہشوں کو مقدس نہ جانتے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے

گئی رُت

پھر آ گئی رت تمہیں خبر بھی نہیں
خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ جگر
نشتر ہے سر دہلیز کوئی بام نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمہارے جاتے ہی
فلک کا چاند ، زمین کے گلاب راکھ ہوئے
وہ راکھ خواب ہوئی پھر وہ خواب راکھ ہوئے
تم آ سکو تو میں سمجھوں تمہارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر ایک ستارۂ مژگان سے مہتاب بنے
برس فراق کا جیسے وصال کا پل تھا

کردار

ہم ابھی ایستادہ تھے

اب سے کچھ پہلے

وفا کے فرش پائیدہ پہ

خوش وقتی کے رنگین شامیانوں کے تلے

اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں لیے

آندھیوں میں زلزلوں میں

تا قیامت ساتھ دینے کے لیے

آمادہ تھے

ایک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل

یار بھی اغیار بھی

چند آنکھوں میں نمی

چند آنکھوں میں حقارت، برہمی

چند آنکھوں میں سکوتِ الٰہی

جم گئے سائے ادھر

اور کانپ اٹھی اس طرف دیوار بھی

دشمنوں کو بھی یقیں

اور بدگماں کچھ ہم نشیں ...... غم خوار بھی

دیکھنے والوں نے دیکھا

کس طرح صدیاں اچانک
ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانوں کی طنابیں کٹ گئیں
بجھ گئیں شمعیں قرار وقول کی
فرش وفا کی سخت و پائندہ سلیں بھی پھٹ گئیں
اور دو پیکر
خود اپنے خنجروں کے وار سے
خاک وخوں میں تر بتر
فرش پر افتادہ تھے
ہم ابھی ایستادہ تھے

غزل

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہمسفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روز نا جرمن نژاد

روز نا جرمن نژاد

اس کے ہونٹوں میں حرارت

جسم میں طوفان

برہنہ پنڈلیوں میں آگ

نیت میں فساد

رنگ و نسل و قامت قد

سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز

ہر کسی سے بے تکلف ایک حد تک دلنواز

وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس

عمر شاید بیس سے اوپر برس یا دو برس

روز نا جرمن نژاد

اور دیکھنے والوں میں سب

اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب

پیکر تسلیم و سرتا پا طلب

ان میں ہر اک متاع گل

بہائے التفات نیم شب

روز نا جرمن نژاد

اور اس کا دل زخموں سے چور

اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کے رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خوں
ہر چاند کے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بت
ایستادہ ہے بچشم ناصبور
کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستکِ خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی
چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرت تعمیر بھی

الوداعی شام، آنسو، عہد و پیان
مضطرب صیاد بھی نخچیر بھی
کون کرسکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرف وفا

نومید چاہت کا غرور

روزنا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی

پھر بھی چہرے پر اداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن

اجنبی کا ملک جس میں چار سو

تاریکیاں ہی خیمہ زن

سب کے سایوں سے بدن

روزنا مرمر کا بت

اور اس کے گرد

ناچتے سائے بہت

سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا

ایک ہی سب کی صدا

وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس

عمر شاید بیس سے اوپر برس یا دو برس

اس کی آنکھوں میں تجسس اور بس

غزل

بدن میں آگ سے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہر غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

بہارِ خوں سے چمن زار بن گئے مقتل!
جو نخل دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

فراز سنگ ملامت ہے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

غزل

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فراز اور اسے حال دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لیے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے ارے زمانے جا

بہت ہے دولت پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے روٹھ چکا ہے اسے منانے جا

سنا ہے اس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فراز تو بھی مقدر کو آزمانے جا

غزل

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
ہمیں کو شوق ہے راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبی قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ چلنے کا

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر سہی پر نگاہِ لطف کے بعد
فراز دیکھ سماں برف پگھلنے کا

غزل

گزرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

لو ہو چکی شفا کہ مداوائے دردِ دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابر گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تاب کے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اے بدنصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا مقدر لگے مجھے

منزل کہاں کی زاد سفر کی کو بچائیو
اب رہزنوں کی نیتِ رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی

ایسی خموشیوں سے مگر ڈر لگے مجھے

وہ قحطِ حروف حق ہے کہ اس عہد میں فراز
خود سا گنہگار پیمبر لگے مجھے

غزل

مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہوئی ہے پتھر کی

رواں ہے قلزمِ خوں اندروں شہر بھی دیکھ
کہ خوش نما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اجاڑ پیڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجو کو ہوس پی گئی سمندر کی

فقیہہ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدر کی

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتھر کی

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فراز ہر گھر کی

غزل

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اس کا

وہ برق رو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اس کا

چلو یہ سیل بلاخیز ہی بنے اپنا
سفینہ اس کا ، خدا اس کا ، ناخدا اس کا

یہ اہل درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اس کا

ہمیں نے ترک تعلق میں پہل کی کہ فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا

غزل

چلو اسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اسے کے درد سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہگذر پہ جو شمعیں دمکتی جاتی ہیں
اسی کا قامت زیبا ہے چال جو بھی ہو

فراز اس نے وفا کی کہ بے وفائی کی
جواب وہ تو ہمیں ہیں سوال جو بھی ہو

غزل

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں پھر تجھے دکھائی نہ دوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزام بے وفائی نہ دوں

مری بقاء ہی مری خواہش گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہر پارسائی نہ دوں

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
حریف جاں کو کبھی طعن آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محو آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد

کہ دوسروں کو تو الزام نارسائی نہ دوں

فراز دولت دل متاع محرومی
میں جام جم کے عوض کاسۂ گدائی نہ دوں

غزل

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے سبک رو، اے حریف جاں ذرا آہستہ چل

منزلوں پر قرب کا نشہ ہوا ہو جائے گا
ہمسفر وہ ہے تو اے ناداں ذرا آہستہ چل

نامرادی کی تھکن سے جسم پتھر ہو گیا
ا سکت کیسی دل ویراں ذرا آہستہ چل

جام سے لب تک ہزاروں لغزشیں ہیں خوش نہ ہو
اب بھی محرومی کا ہے امکاں ذرا آہستہ چل

ہر تھکا ہارا مسافر ریت کی دیوار ہے
اے ہوائے منزلِ جاناں ذرا آہستہ چل

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اے غریب شہرِ ناپرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فراز

کچھ تو ظالم پاسِ ہمراہاں ذرا آہستہ چل

غزل

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ تھا
تجھے بھی رنج ہوا بات اک ذرا سی کا

فراز آج شکستہ پڑا ہوں بت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا

غزل

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی، کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزمِ مے تری ساقی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

گر مے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشمِ یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ ہنر کو کوئی خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

غزل

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترکِ تعلق کی صورتیں تھیں بہت

ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھل کے باتیں کیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھلا دیئے ہیں ترے غم نے دکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھر کی مورتیں تھیں بہت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فراز دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

غزل

سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لیے بہانہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

تکمیل طلب نہیں ہے منزل
طے راہ وفا قدم قدم کر

اے پچھلی رُتوں کو رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشۂ ہنر سے
ہر پارۂ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دنیا
پتھر کی طرح نہ بیٹھ جم کر

یہ راہ جنوں ہے اس میں پیارے

ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصر جہاں یہ تیرا معمار
تو ہاتھ فراز کے قلم کر

غزل

دولت درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کو خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منور رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب نہیں تھی دل کو ترے آ جانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کیسا ہی اٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

غزل

یار آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسم زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے

اس قدر زہر نہ تھا طنز حریفاں پہلے
اب تو کچھ خندۂ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فراز
بعض اوقات دلاسہ بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا ! اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح

اپنے سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لیے ہنستا رہا میری طرح

ضوفشاں حسن تیرا میرے ہنر کی صورت
اور مقدر میں اندھیرے کی ردا میری طرح

وہی تقدیر تیری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا نخچیر جفا میری طرح

تیرے منظر بھی ہیں ویراں میرے خوابوں جیسے
تیرے قدموں میں بھی زنجیر وفا میری طرح

وہی صحرائے شب زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانۂ جاں دشت بلا میری طرح

آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح

چاند نے مجھ سے کہا! اے میرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے میرے قریۂ تنہائی کا

تجھ کو معلوم ہے جو زخم میری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرف تیری شناسائی کا

موجزن ہے میری اطراف میں اک بحر سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تیری گویائی کا

آج کی شب میرے سینے پہ وہ قابیل اترا
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہو بھائی کا

میرے دامن میں نہ ہیرے ہیں نہ سونا چاندی
اور بجز اس کے نہیں شوق تمنائی کا

مجھ کو دکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ میری تنہائی کا

غزل

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

وار اس قدر شدید کہ دشمن ہی کر سکے
چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

اب یہ کہ اپنی کشت تمنا کو رویئے
اب اس سے کیا گلہ کہ وہ بادل ہوا کا تھا

تو نے بچھڑ کر اپنے سر الزام لے لیا
ورنہ فراز کا تو یہ رونا سدا کا تھا

غزل

لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بخشے وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آ گئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے

غزل

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبت کہاں کہ مدت سے
نہ ابتدا کی طرح نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

غزل

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی

کوئی خدا ہو کہ پتھر جسے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نبھاتے ہیں

ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

کبھی فراز نئے موسموں میں رو دیتا
کبھی تلاش پرانی رفاقتیں کرنی

غزل

فقیہِ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا
کہ اس سے مل کر مزاج اور کافرانہ ہوا

ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا

وہ رات بھول چکو وہ سخن نہ دہراؤ
وہ رات خواب ہوئی وہ سخن فسانہ ہوا

کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
تری ہی بات نہیں، میں بھی کیا سے کیا نہ ہوا

ہجوم ایسا کہ راہیں نظر نہیں آتیں
نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہوا

شہیدِ شب فقط احمد فراز ہی تو نہیں
کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہوا

THE END........ختم شد ....